معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، جلد:۱، شمارہ:۲ جولائی-دسمبر ۲۰۰۹ء

تبصراتی مقالہ

# تاریخ کا جبر اور ولیم ڈالرمپل کا آئینہ

## The Last Mughal: The Fall of a Dynasty, 1857

By: William Dalrymple, 2007, India: Penguin Books, pages 578

نجیبہ عارف*

انسان کسی نہ کسی حد تک اپنے حال یا مستقبل کی صورت گری تو کر سکتا ہے لیکن ماضی اس کا دوسرا پاؤں ہے جسے اٹھا کر کھڑے رہنا اس کے اختیار میں نہیں۔ تاریخ جبر کا ورثہ ہے۔ یہ وہ ٹھنڈی راکھ ہے جسے کرید کر انگلیاں ہی نہیں، دل بھی جلتا ہے۔ اسی لیے ہم عموماً ریت میں گردن دبا کر پڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے پس و پیش کو اپنے خود ساختہ تصورات کی محفوظ عینک اور مخصوص زاویے سے دیکھنے پر قانع رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے کہ تاریخ سے صدیوں کی دوری کے باوجود ہم تاریخ کے کرب کو اپنی رگوں میں بہتے لہو سے نکال نہیں پاتے۔ خواہ شعوری سطح پر ہم اسے محسوس کریں یا نہ کریں، لیکن تاریخ ہمارے وجود کی ہر خارجی اور باطنی حقیقت پر مثبت رہتی ہے۔ جس طرح وہ مٹی جس میں بیج بویا جاتا ہے، شجر سے چپکی نہیں رہتی لیکن شجر کی حقیقت میں شامل ہوتی ہے، اسی طرح تاریخ، ہمارے حال کا حصّہ نہ ہوتے ہوئے بھی ہر حال میں ہمارے شاملِ حال رہتی ہے۔ تاریخ سے منہ موڑ کر جانے کی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن تاریخ کبھی ہم سے منہ نہیں موڑتی۔ یہ فرائیڈ (۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) کے انفرادی اور یونگ (۱۸۷۵ء-۱۹۶۱ء) کے اجتماعی لاشعور کی طرح، اور ادب کی زبان میں بات کریں تو پیرِ تسمہ پا کی طرح ہر عرصۂ حیات پر سوار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ہماری تاریخ کے آئینے سے نقاب اٹھاتا ہے تو اپنے چہرے کی خراشیں دیکھ کر ویسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسی کسی حادثے میں چہرہ مسخ ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ آئینہ دیکھ کر ہوتی ہے۔ ولیم ڈالرمپل کی کتاب *The Last Mughal* کا مطالعہ کچھ ایسی ہی کیفیات کا محرک بنا۔

ولیم ڈالرمپل ۱۹۶۵ء میں، سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے۔[1] ان کے دادا ھیو ہملٹن ڈالرمپل، معروف ناول نگار ورجینیا وولف (۱۸۸۲ء-۱۹۴۱ء)[2] کے رشتے کے بھائی تھے[3]۔ ان کی فن کار بیوی اولیویا فریزر کا تعلق ولیم فریزر (۱۷۸۴-۱۸۳۵) کے خاندان سے ہے۔ یہ وہی ولیم فریزر ہیں جو انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں مغلیہ تراش کا لباس پہن کر مولانا شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء-۱۸۲۳ء) سے فارسی اور عربی کا درس لینے جاتے تھے اور اپنے چہرے پر دہلی والوں کے طرز کی مونچھیں اور حرم میں چھے ہندوستانی بیگمات رکھتے تھے۔ انھیں ان کے ہم وطن نیم

* استاد و نگران شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

ایشیائی سمجھتے تھے کیوں کہ وہ گائے اور سؤر کے گوشت سے اجتناب کرتے تھے اور فارسی اور اردو شاعری کا بھی ذوق تھا۔[۴]

یوں ڈالرمپل کو وراثت میں جہاں افسانہ تراشی کا ہنر ملا ہے وہیں سسرال کے رشتے سے ہندوستانی ثقافت سے گہری محبت اور شناسائی کا ذوق بھی ملا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اس قوم کے فرد بھی ہیں جس نے ہماری تاریخ کو زبردستی اپنے نقوشِ پا سے روند ڈالا تھا۔ان کی شخصیت کی یہ تمام جہتیں ان کی تاریخ نویسی میں نظر آتی ہیں۔تاریخ ان کا پسندیدہ مضمون ہے اور وہ تاریخ کے ایوانوں میں ایک افسانہ نگار کا قلم لے کر داخل ہوتے ہیں۔ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جن کا موضوع قدیم و جدید ہندوستان کی تہذیبی و سیاسی تاریخ ہے۔انھیں کئی ایوارڈ اور اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں جن میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے ملنے والی ڈاکٹریٹ کے علاوہ ڈی لٹ کی ڈگری بھی شامل ہے۔تاریخ کے حوالے سے وہ برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں اور ان کی کتابیں برطانیہ کے علاوہ، ہندوستان میں بھی غیر معمولی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔[۵] کتابوں کے علاوہ انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے کئی سیریل بھی لکھے ہیں۔[۶] دہلی ان کا دوسرا گھر ہے اور وہ ہر سال سردیوں کا موسم یہیں گزارتے ہیں۔پاکستان بھی آنا جانا رہتا ہے۔ان کی دلچسپی کا محور برعظیم پاک و ہند کا یہی خطہ ہے جسے اسرار کی سرزمین کہا جاتا ہے۔

*The Last Mughal* اس حوالے سے ان کی معروف ترین کتاب ہے۔

یہ کتاب ہمارے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے کیوں کہ اس کا تعلق ہمارے ماضی سے ہے۔وہ ماضی جو حال کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی حال میں شامل رہتا ہے۔۱۸۵۷ء کا سال برعظیم کے لیے سیاسی اعتبار ہی سے نہیں، تہذیبی و ثقافتی حوالے سے بھی ایک عجیب موڑ ثابت ہوا۔یوں تو قوموں کی زندگی میں کوئی بھی واقعہ یا حادثہ بالکل اچانک یا اتفاقی طور پر رونما نہیں ہوتا۔دریا اچانک خشک نہیں ہو جاتے، درخت ایک دن میں نہیں سوکھتا، تہذیب چند سالوں میں تبدیل نہیں ہوتی اور معاشرہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنا رُخ نہیں بدل لیتا۔سماجی سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ تہذیبی و ثقافتی تبدیلیاں آہستہ رو اور ارتقائی نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن بعض واقعات اس عمل کو مہمیز کر دیتے ہیں اور کئی برسوں میں رونما ہونے والے ارتقا کو مہینوں، دنوں اور ہفتوں میں مکمل کر دیتے ہیں۔۱۸۵۷ء کی جنگ بھی ایسا ہی واقعہ تھی جس کے بارے میں ابھی تک متفقہ طور پر یہ طے نہیں ہو پایا کہ یہ بغاوت تھی، غدر تھا، جنگِ آزادی تھی یا کفار کے خلاف اہلِ اسلام کا جہاد تھا۔[۷] مگر اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء میں رونما ہونے والے واقعے نے تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی تبدیلی کے عمل کو یکا یک تیز کر دیا تھا۔تاہم یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ یہ واقعہ اس تبدیلی کا واحد محرک بھی تھا۔[۸]

اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ سے نکل کر دورِ جدید میں داخل ہونے کے عمل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔[۹] اس حوالے سے ۱۸۵۷ء کا واقعہ بھی موضوعِ بحث بنا اور کئی زاویوں سے اسے دیکھا اور پرکھا گیا۔ابھی دو سال قبل ۲۰۰۷ء میں ایک سو پچاس سال مکمل ہونے پر اس کی خصوصی یاد منائی گئی اور نئے سرے سے اس کے عوامل اور اسباب و نتائج کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی[۱۰]۔اس عمل میں جہاں ہم، یعنی وہ لوگ شامل ہوئے جن کی زندگیاں اس سے براہ راست متاثر ہوئیں، وہاں ایک کتاب دیوار کے اس پار سے بھی آئی جس میں اس واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ولیم ڈالرمپل کی یہ کتاب ۱۲ اپریل ۱۸۵۲ء کو لال قلعے کے لاہوری دروازے سے نکلنے والی، شہزادہ جواں بخت کی بارات کے شاہانہ جلوس کے بیان سے شروع ہوتی ہے اور ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کی دھند آلود شام کو رنگون کے ایک غیر معروف مقام پر، بہادر شاہ ظفر کے تہِ خاک ہو جانے کے عبرت

انگیز لمحے تک دلّی اور اس کے آخری مغل شہنشاہ کی زندگی کی کہانی بیان کرتی ہے۔ دس سالوں پر محیط اس عرصے کی روداد بیان کرتے کرتے ڈالرمپل نے ماضی اور مستقبل دونوں کو ہمراہ رکھا ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں تین موضوعات کو توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے:

[۱]

## شاہِ شطرنج: بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵۔۱۸۶۲ء)

اس کتاب کا عنوان اور بظاہر اس کا مرکزی موضوع بہادر شاہ ظفر کی شخصیت ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کی دلّی کے گلی کوچے جن تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کی چہل پہل سے رنگین تھے، ان کا مرکز لال قلعہ تھا اور ان کی سرپرستی کا شرف بہادر شاہ ظفر کو حاصل تھا۔ ظفر کا عہد حکمرانی ہندوستان میں علم و ادب اور فن کی نشاۃ الثانیہ کا دور تھا اور وہ خود ایک صوفی شاعر، خطاط اور فلسفی تھا۔ ڈالرمپل نے ظفر کے دربار کو تہذیب و ثقافت کا ایسا مرکز قرار دیا ہے جو مغلیہ تمدن کی روشن خیالی، اعتدال پسندی، تکثیریت اور رواداری کا آئینہ دار تھا۔ وہ رواداری جو دو صدیاں قبل، مغلِ اعظم، شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ایوانوں میں بلوغت کو پہنچی تھی اور تاریخ اسلام میں آج تک متنازعہ رہی ہے۔[۱۱] اور جس نے مذہبی آزادی کا ایسا معیار قائم کیا تھا جس کی کوئی نظیر ڈالرمپل کے بقول، آئندہ دو سو سال تک یورپ میں بھی نظر نہیں آتی۔[۱۲] مغلیہ تمدن کی اس خوش ادائی کی مثال دیتے ہوئے وہ غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) کے خط کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس میں غالب اپنے دوست کو، اس کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے، شہد کی مکھی کی بجائے مصری کی مکھی بننے کی تلقین کرتے ہیں اور ہر بہار میں ایک نئے حسین کی تلاش کا مشورہ دیتے ہیں[۱۳]۔ گریشم کالج میں اسی کتاب کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے، وہ غالب کا یہ اقتباس سنانے کے بعد کہتے ہیں:[۱۴]

So you get the picture of the court of the time. This is no dull, puritanical, wahabi sort of centre of hypocracy. This is a lively court life.

برسبیلِ تذکرہ اسی بہادر شاہ ظفر اور اس کے دربار کے بارے میں ڈالرمپل کے ایک ہم وطن سپاہی نے، جو انیسویں صدی کے نصف اول میں فوج میں لفٹنٹ بھرتی ہو کر ہندوستان آیا اور اپنے جرنیل انکل کے ساتھ پوری سلطنت کا دورہ کیا، یوں تبصرہ کیا:[۱۵]

A dirty, miserable, old dog like this man!!

اور دلّی کے اس لال قلعے کے بارے میں موصوف کا خیال یہ تھا:[۱۶]

The great Mughal still lives in the palace of his ancestors, if a ruinuous mass of mud and dirt can be called such.

اس پس منظر میں ڈیڑھ سو سال بعد اگر ڈالرمپل بہادر شاہ ظفر کو اپنے عہد کا صوفی، فلسفی اور فن کار بادشاہ قرار دیتا ہے تو ہمیں یقیناً اس پر پیار آتا ہے اور آنا بھی چاہیے لیکن ایک کھٹک سی بھی سینے میں رہ جاتی ہے۔ کتاب کا پہلا باب، جس میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک ایسے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے جسے ہم ظفر کی زندگی کا زیادہ معتبر استعارہ سمجھ سکتے ہیں اور یہ عنوان ہے ''شاہِ شطرنج'' (A Chessboard King) نجانے ظفر سے اتنی گہری عقیدت اور احساسِ عظمت وابستہ کرنے کے بعد ڈالرمپل نے اسے شاہ شطرنج کا

خطاب کیوں کر دے ڈالا اور ان تمام تلازمات کو ذہن میں کیوں نہ رکھا جو بساط کے ایک مہرے سے منسلک ہیں خواہ وہ شاہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ البتہ سچ ہے کہ تاریخ ان کے اس عنوان کی توثیق کی طرف زیادہ مائل رہی ہے بہ نسبت اس غیر معمولی عظمتِ کردار کے جسے ڈالرمپل نے داستانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ مؤرخین نے بہادر شاہ ظفر کو ایسے مرحلے پر تخت و تاج سنبھالنے بلکہ نہ سنبھال سکنے پر رعایتی نمبر بھی دیے ہیں جب تاریخ اس سلطنت کے مستقبل کے متعلق اپنا فیصلہ مرتب کر چکی تھی اور صرف اس کا باقاعدہ اعلان باقی تھا جسے ۱۸۵۷ء کے واقعے نے قریب تر کر دیا تھا۔[۱۷]

انگریز لیفٹننٹ کے انتہائی بیان کو ایک طرف رکھیں اور خود اپنے محققین کی طرف دیکھیں تو ڈاکٹر اسلم پرویز بہادر شاہ ظفر پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں، ان کے آخری بیان کے بارے میں، جو انھوں نے انگریز افسروں کو تحریری طور پر پیش کیا تھا، لکھتے ہیں:

---اس کی عبارت کے اندر سے بہادر شاہ ظفر کی کمزور اور بزدل شخصیت صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی شخصیت، جس نے ایک باغی کی موت مرنے کے بجائے قید و بند کی اس موت کو ترجیح دی جو اسے انتہائی ذلّت کے ساتھ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نصیب ہوئی۔ اسّی برس کی عمر میں زندہ رہنے کی خواہش اور نام نہاد بادشاہت کی ہوس نے بہادر شاہ کو بہادری کی موت نہ مرنے دیا۔[۱۸]

دراصل دلّی کا یہ آخری تاج دار اپنے لال قلعے میں جس طرح انگریزوں کے وظیفے پر روز و شب بسر کر رہا تھا، اس کی تفصیل جاننے کے بعد اسلم پرویز کی یہ توقع کچھ بے جا معلوم ہوتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر جس صلابتِ کردار سے زندگی بھر محروم رہے اس کا مظاہرہ اپنے اقتدار اور زندگی کے آخری لمحوں میں کیسے کرتے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کی اس ذلت اور درماندگی کے اسباب میں کتنا قصور ان کا اپنا تھا اور کتنا غیروں کا، ان کا طرزِ عمل کہیں بھی تہوّر و شجاعت کے اس معیار پر پورا اترتا دکھائی نہیں دیتا جس کی توقع ایک زندہ قوم اپنے بادشاہ سے رکھتی ہے۔ (خود وہ قوم زندہ قوم کے معیار پر کس حد تک پوری اترتی ہے، ایک الگ سوال ہے)۔ انھوں نے اپنے حقِ ولی عہدی کی حفاظت کے لیے انگریزوں سے ساز باز کی تھی[۱۹] اور ان کی مدد اور تعاون سے تخت نشیں ہوئے تھے کیوں کہ اس وقت برطانوی افسروں کو وہ بالکل بے ضرر دکھائی دیتے تھے۔ اسی طرح اپنی نوجوان بیگم زینت محل (۱۸۲۱-۱۸۸۲ء) کے لاڈلے شہزادے کو ولی عہد سلطنت بنانے کی ہر ممکن سعی[۲۰] بتاتی ہے کہ ان کا طرزِ عمل مجبوری و بے چارگی کا مظہر تو تھا مگر صوفیانہ زہد و اتقا کا آئینہ دار نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ اکبر شاہ ثانی (۱۷۵۴ء؟-۱۸۳۷ء) اور دیگر اجداد کی طرح اپنی نوجوان ملکہ کی رائے اور مشاورت پر غیر ضروری انحصار کرنے کے عادی تھے۔ تصوف کی جو جھلک ان کے ہاں ڈالرمپل اور اس سے پہلے سپئیر نے دیکھی اور بیان کی ہے[۲۱]۔ وہ درحقیقت اس انفعالیت کی ترجمان ہے جس کا شکار دودمانِ مغلیہ کا یہ آخری تاجدار ہی نہیں، ہندوستان کا پورا مسلم سماج ہو چکا تھا اور جس کے نتیجے میں جادو ٹونے کی طرح تعویز گنڈے سے دنیاوی حاجت براری کی کوشش کی جاتی تھی۔ ظفر بھی ان مشاغل پر اعتقاد رکھتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی مشکلیں آسان کرنے کے لیے اکثر اس کا سہارا لیتے تھے[۲۲]۔ تاہم ان کی شخصیت کا یہ رُخ انھیں کسی نہ کسی سطح پر تصوف کا قائل تو ثابت کر سکتا ہے، صوفی و درویش نہیں۔ رہی ان کی شاعری کے صوفیانہ عناصر کی بات تو ان کی زندگی جس کرب والم اور محرومی و دل گدازی کا شکار رہی تھی اس کے نتیجے میں اشعار میں علائقِ دنیا سے بے نیازی کا رویہ در آنا اس دور کے شعری اسلوب میں کوئی بڑی بات نہ تھی۔ یوں بھی متصوفانہ مضامین کلاسیکی شاعری کا ہمیشہ سے حصہ رہے ہیں اور ان کی بنا پر کسی کو صوفی و درویش نہیں کہا جا سکتا۔ ظفر کی شخصیت میں عجز و انکسار اور انفعالیت ضرور تھی مگر جن حالات میں انھوں نے زندگی بسر کی، ان کا نتیجہ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا۔

ڈالرمپل کے ظفر کو ایک صوفی و درویش ثابت کرنے کے پس پشت دو اسباب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ وہ بنیادی طور پر ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔ (ٹیلی وژن اور ریڈیو کے کئی ڈراما سیریل لکھنے کے بعد ان کے اسلوب پر اس انداز کی ایک غیر شعوری چھاپ پڑتی نظر آتی ہے۔) اس ڈرامے کے الم ناک پہلو اجاگر کرنے کے لیے اس کے ہیرو کو عظمتِ کردار عطا کرنا ضروری تھا اور دوسری یہ کہ ان کی رائے پر ان کے پیش رو انگریز مصنفین کی تحریریں اثر انداز ہوئی ہیں، جنھوں نے ظفر کو اکبر شاہ ثانی کے نامزد کردہ ولی عہد کے مقابلے میں ایک بہتر انسان کے طور پر پیش کیا ہے[۲۳] اور ان کے پیش رووں کی اس خوش گمانی کا اصل سبب یہ ہے کہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی، جو مغل روایات کے مطابق اپنے کسی بھی شہزادے کو ولی عہد نامزد کرنے کا اختیار رکھتے تھے، اپنے تیسرے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔[۲۴] اگرچہ اس فیصلے کے پس پشت بھی سیاسی مصالح نہیں بلکہ ان کی چہیتی بیگم ممتاز محل کی خوشنودی حاصل کرنے کا مقصد کارفرما تھا تاہم وہ قانوناً اس امر کے مجاز تھے کہ جسے چاہیں اپنا ولی عہد منتخب کریں۔[۲۵] مگر اس دور تک انگریزوں کا عمل دخل کارِ سرکار میں اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ انھیں مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانے سے روک دیا گیا[۲۶] کیوں کہ مرزا جہانگیر نہایت خود رائے اور دلیر نوجوان تھا اور انگریز افسروں سے مرعوب ہونے کے بجائے انھیں تفنن اور تضحیک کا نشانہ بنانے سے بھی نہ چوکتا تھا۔[۲۷] انگریز اسے کسی قیمت پر ہندوستان کا آئندہ بادشاہ بنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے چناں چہ انھوں نے ابوظفر کا انتخاب کیا۔ انگریزوں نے بھانپ لیا تھا کہ ابوظفر ان کی راہ میں رکاوٹ بننے کے اہل نہیں۔ وہ کمزور اور بے عمل شخصیت کے مالک تھے اور انگریزوں کی مطلب براری کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے چناں چہ، چارلس میٹکاف (۱۷۸۵ء۔۱۸۴۶ء)، جس نے انگریز ریزیڈنٹ کی شاہی خاندان کو تعظیم دینے کی روایت پر سخت تنقید کی تھی، بادشاہ کو نذر پیش کرنے کی رسم ترک کر دی تھی اور ہندوستانیوں سے رعونت اور سختی سے پیش آنے کی شہرت رکھتا تھا، ظفر کو تمام شہزادوں سے زیادہ قابلِ احترام اور لائقِ عزت قرار دیتا ہے۔[۲۸] اس سارے قصے سے یہ بات ضرور سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ۱۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کی رات کو جب ظفر سلطنتِ مغلیہ کے تاج دار مقرر ہوئے تو محض اس وجہ سے کہ انگریز اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر ابھی بادشاہ کے منصب کو ختم کر دینے کے حق میں نہیں تھے اور ایک کٹھ پتلی بادشاہ ان کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھیں ظفر زیادہ مفید محسوس ہوئے۔ اپنے انتخاب کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے انھوں نے ظفر کو ایک صوفی شاعر اور درویش صفت انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور مرزا جہانگیر کو عیاش اور غیر ذمہ دار ثابت کیا ہے تاکہ بادشاہ کے اپنا ولی عہد منتخب کرنے کے جائز حق کی پامالی کے عمل کو درست اور دانش مندانہ فیصلہ ثابت کر سکیں۔ ڈالرمپل نے غالباً غیر شعوری طور پر اس روایت کی پیروی کی ہے۔

یہ درست ہے کہ ظفر کی شخصیت میں ترحم، عام انسانی ہم دردی اور حسنِ اخلاق کے پہلو نمایاں تھے اور ان کا ذکر دیگر مؤرخین نے بھی کیا ہے[۲۹] مگر ان پہلوؤں کو ان کی عظمتِ کردار کی دلیل تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس جنگ کے دوران ہی نہیں، اس سے پہلے بھی ان کی شخصیت بودی اور کمزور نظر آتی ہے، ان میں انتظامی صلاحیتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔[۳۰] وہ ضعیف الاعتقاد ہیں اور اپنے محل میں ہونے والی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور غداری و بے وفائی کو سمجھنے کے اہل نہیں۔ مولوی ذکاء اللہ جیسے لوگ تو انھیں حریص و زر پرست قرار دیتے ہیں۔[۳۱] وہ ناجائز طریقے سے عوام کا روپیہ ہتھیانے کی حرکت میں بھی ملوث نظر آتے ہیں۔[۳۲] امراء سے نذر نذرانے کی آرزو رکھنا تو معمول

ہی تھا یہاں تک کہ بعض افراد بھاری نذرانے دے کر ان کے عوض اعلیٰ مناصب کے حصول کے لیے بادشاہ کو دھمکانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔[۳۳] بادشاہ کی آئینی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ انگریز کے وظیفہ خوار تھے اور اپنے دورِ بادشاہی میں اپنے وظیفے میں اضافے کی درخواستیں دینے میں مصروف رہتے تھے۔[۳۴] یہ مغل شہنشاہ مختلف ساہوکار حیثیت کے مالک لوگوں سے قرض لینے کا اس حد تک عادی تھا کہ لوگ اس کے سامنے اپنی خوش حالی کا تذکرہ کرنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں وہ قرض نہ مانگ لے۔[۳۵] اپنے محل کے اخراجات ادا کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ ان کی آمدنی کے تمام ذرائع مسدود تھے اور دائرۂ اختیار محدود تر۔ اس کے باوجود یا شاید اسی سبب سے وہ شاہانہ طرز زیست کے مشاغل میں مصروف رہے۔ شراب نہیں پیتے تھے، مگر اس کے علاوہ ہر طرح کی عشرت سے سروکار رہا۔ بہتر برس کی عمر تک شادیاں کرتے رہے۔[۳۶] زینت محل، جو عمر میں ان سے چھیالیس برس چھوٹی تھی، ان کے مزاج اور فیصلوں پر شدت سے اثر انداز ہوتی تھی۔[۳۷] اسی کے کہنے پر انھوں نے انگریزوں کی مرضی کے خلاف مرزا جواں بخت (۱۸۴۱ء۔۱۸۸۴ء) کو ولی عہد بنانے کی کوشش کی۔[۳۸] زینت محل کی خودغرضی اور عاقبت نااندیشی کا یہ حال تھا کہ جنگ کے اختتام پر جب میجر ہڈسن (۱۸۲۱ء۔۱۸۵۸ء) اسے اور بادشاہ کو گرفتار کرنے ہمایوں کے مقبرے میں پہنچا اور جب خود اس کی اور بادشاہ کی جان سخت خطرے میں محسوس ہو رہی تھی، زینت محل نے انگریزوں کے سامنے پیش ہونے کی جو شرائط رکھیں ان میں سے اہم ترین شرط یہ تھی کہ مرزا جواں بخت کو ولی عہد تسلیم کر لیا جائے۔[۳۹] بہادر شاہ ظفر اس موقع پر بے بسی اور بے چارگی کی تصویر دکھائی دیتے ہیں۔

ان تمام ٹکڑوں کو جوڑ کر ظفر کی شخصیت کا جو موزیک تیار ہوتا ہے وہ کسی طرح بھی قابلِ فخر نہیں لگتا۔ اگرچہ ہمیں اس صورت حال کے پیدا کرنے میں انگریزوں کے عیارانہ اور سفاکانہ کردار کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا طرزِ عمل کہیں بھی ایک اصول پرست اور انصاف پسند قوم کے طرزِ عمل کے موافق نہیں۔ انھوں نے جس طرح مکاری سے سازشوں کا جال بنا اور ہندوستان کی سلطنت پر رفتہ رفتہ قابض ہوتے چلے گئے،[۴۰] اس کا رنج تو کیا جا سکتا ہے مگر شکوہ نہیں۔ اس لیے کہ ہندوستان کی سلطنت اپنی داخلی کمزوریوں اور اپنے حکمرانوں کی عاقبت نااندیشیوں کے نتیجے میں کسی بھی طالع آزما کو مہم جوئی کی دعوت دینے کی اہل بن چکی تھی۔ یہ طالع آزما جرمِ ضعیفی کی سزا تھے اور یہ جرمِ ضعیفی نااہل، خودغرض اور بوالہوس بادشاہوں کے اعمال کا نتیجہ تھا۔ مگر ہندوستان کے عوام و خواص مجموعی طور پر ملوکیت پسندی کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ انھیں مشکل وقت میں اپنے کمزور بادشاہوں سے بھی ویسی ہی ہمدردی محسوس ہوتی تھی جیسی ارسطو کے المیہ ڈرامے کے ناظرین کو اپنے ہیرو کے المناک انجام پر ہوتی تھی اور جس کے ذریعے وہ اپنی کمزوری اور بے بسی کے رنج کا کتھارسس کر لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے عوام نے اپنے غاصب یا نااہل بادشاہوں کا ہاتھ خود روکنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مسلم ہندوستان کی پوری تاریخ میں کبھی کوئی ایسی عوامی تحریک پیدا نہ ہوئی جو خود اپنے بادشاہوں کی غلط پالیسیوں پر تنقید اور ان کی اصلاح کا مقصد رکھتی ہو۔ مسلمان علما نے وقتاً فوقتاً صدائے احتجاج بلند کی[۴۱] مگر اس کا مقصد بھی زیادہ تر دینی عقائد کی حفاظت اور ان کی ترویج سے متعلق رہا۔[۴۲] حکمرانوں کا اخلاقی زوال بالآخر پوری قوم کا زوال بن جاتا ہے۔ بیرونی عناصر اس سے شہ پکڑتے ہیں اور فطرت کے قوانین لاگو ہو کر رہتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر اس زوال کی آخری منزل تھے۔ ان کا عجز و انکسار ان کی بے بسی اور بے چارگی کا مظہر تھا۔ جب اختیار چھن چکا ہو تو خاکساری بے معنی صفت قرار پاتی ہے۔ اسے فقر و درویشی نہیں کہا جا سکتا۔

## [۲]
## دلّی

کتاب کے بارہ میں سے پہلے تین ابواب کا مرکزی کردار دلّی ہے۔ وہ دلّی جو گیارھویں باب تک شہرِ خموشاں بن چکی تھی۔ وہ دلّی جہاں جنوبی ایشیا کی ایک عظیم تہذیب پروان چڑھی، عروج کو پہنچی اور پھر دم توڑ گئی۔ وہ دلّی جو میر وسودا کی دلّی تھی، غالب ومومن کی دلّی تھی، لال قلعے اور جامع مسجد والی دلّی، پھول والوں کی سیر اور گھنٹہ والوں کی دلی، مجروں اور مشاعروں کی دلّی، غزلوں اور قصیدوں کی دلی، باغوں اور فواروں کی دلّی۔ اس کتاب کے صفحات پر دلی کے مرقعے بکھرے ہوئے ہیں۔ دلّی کے لوگ، دربار شاہی سے وابستہ افراد، اعلیٰ مناصب پر فائز امراء رؤساء اور شعراء کی زندگی، ان کے دسترخوان کی وسعت، ان کی شبانہ دلچسپیاں، ان کے معمولاتِ حیات، ان کے ملبوسات کی وضع قطع، ان کی سواریوں کی شان وشوکت، زینتِ برگستواں کا حال، درونِ خانہ ان کے حرم کی رونق، ان کا ذوقِ حسن اور شوقِ ندرت، تنوع اور نیرنگی سے ان کی محبت اور زندگی سے حظ اٹھانے کی ہرادا۔۔۔

ڈالرمپل نے پہلے تین ابواب میں دہلی کی زندگی کے تمام پہلو بیان کیے ہیں اور اسے ایک ایسے معاشرتی ماحول سے متصف قرار دیا ہے جو مختلف معاشرتی قوتوں کے باہمی تعامل سے انتہائی متوازن طور پر وجود میں آتا ہے مگر دیگر تاریخی شواہد اس کے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے نظر نہیں آتے۔ ڈالرمپل نے ان ابواب میں اپنی کہانی کا پلاٹ کچھ اس طرح تیار کیا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا وہ آخری تاج دار، جو اگرچہ اس مرحلے پر تخت نشیں ہوا جب اس کی سلطنت کی بنیادیں منہدم ہو چکی تھیں اور اس کے پاس کسی بڑی اور انقلابی تبدیلی کا نہ اختیار تھا نہ موقع [۴۳]، ایک ایسی تہذیب کا آخری سرپرست نظر آتا ہے جو ہندو مسلم تمدن کی ہم آہنگی اور تکثیریت کے حامل معاشرے کی عکاس تھی۔ یوں لگتا ہے ظفر کی دلّی مغلیہ سلطنت کے عروج کا آخری نظارہ پیش کرتی تھی لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ ظفر کی دہلی، کسی طور بھی ترقی، خوش حالی اور اطمینان بھری زندگی کا گہوارہ نہیں تھی بلکہ ایک بڑی تہذیب کے انہدام، زوال اور شکست وریخت کا عبرت آموز منظر تھی۔ اس دور کی ثقافتی چہل پہل حقیقت سے گریز بلکہ فرار کی ایک صورت تھی۔ اس دور کا آرٹ، خواہ وہ مصوری ہو یا شاعری، بہ استثنائے چند، زندگی آمیز تو ہے، زندگی آموز نہیں۔ تہذیبیں محض فنِ تعمیر کی دل کشی، مجرے کے بھاؤ اور روزمرے اور محاورے کے زور پر نہیں جی سکتیں۔ یہ پہلو تو ان کی نشوونما کا ایک ضمنی عنوان ہوتے ہیں اور تہذیب کے پھلنے پھولنے کے عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تہذیب کی اصل قوت وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنی تہذیب کے مرکزی اصول پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ ڈالرمپل کا کہنا ہے کہ اس تہذیب کا اصلِ اصول رواداری اور صلحِ کل تھا۔ مگر یہ درست نہیں کیوں کہ اس وقت تک تمام گروہ اپنی علیحدہ شناخت کے اثبات پر مصر ہو چکے تھے۔ خود ڈالرمپل نے ایسے واقعات بیان کیے ہیں کہ عین جنگ کے دوران جب عیدالاضحیٰ کا موقع آیا تو مسلمان علما نے گائے قربان کرنے کا اعلان کر دیا حالاں کہ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان مل کر شریک تھے۔ حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں شیعوں، سنّیوں اور وہابیوں کے درمیان اختلافات کی خلیج گہری ہوئے ایک صدی سے زیادہ بیت چکی تھی اور شاہ ولی اللہ کی مساعی کے باوجود یہ مسئلہ حل نہیں ہو پایا تھا۔ [۴۴] یہی تکثیریت بالآخر اس معاشرے کی شکست وریخت کا سبب بن گئی کیوں کہ معاشرے کا ہر جز واجتماعیت کے احساس سے عاری ہو گیا۔ یہاں تک کہ افراد بھی قومیت کے کسی ایک مشترکہ تصور سے محروم ہو گئے اور انفرادی طور پر پیکارِ حیات میں الجھنے لگے۔ کرائے کے سپاہیوں نے موقع پرستی کا ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ مرکزیت کی روح فنا ہو کر رہ گئی۔ [۴۵] غداری، منافقت اور ذاتی مفاد کے لیے قومی مقاصد کو

پس پشت ڈال دینے کا رویہ ہر سطح پر عام ہو چکا تھا۔ کسی مشترکہ مقصد اور لائحۂ عمل کی غیر موجودگی نے صورت حال کو اور بھی تباہ کن بنا دیا تھا۔[۴۶]

اس عہد کے بالائی طبقے کی اکثر معروف شخصیات بھی نزاکتِ فکر اور لطافتِ ذوق کی مالک ہوں تو ہوں، مگر اعلیٰ انسانی اقدار و فضائل سے متصف نظر نہیں آتیں۔ ان کے فکر و عمل میں تضاد ہے، ان کی وابستگیوں میں استقلال کی کمی دکھائی دیتی ہے، ان کے کردار میں صلابت اور پختگی نہیں ہے۔ یہی حال عوام النّاس کا ہے، وہ تن آسان، عیش کوش اور موقع پرست ہیں۔ جھوٹ، منافقت اور فکری انتشار اس دور کی عام خصوصیات ہیں۔ لوگوں کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہیں اور ان وفاداریوں کا مرکز کوئی نظریہ، اصول یا آدرش نہیں، صرف اور صرف مادی منفعت کا اصول ہے۔[۴۷] چناں چہ جن لوگوں کی وفاداری ایک مثال بھی بنی ہے تو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید نہ کرو۔ یہ اصول اس قوم کے لیے باعثِ فخر نہیں ہو سکتا جس کی ابتدائی تربیت میں حق گوئی کا عنصر سب سے نمایاں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمیں اخلاق، ضمیر اور اصول کی خاطر ڈٹ جانے اور اپنے مربیوں سے اختلاف کرنے کی مثالیں عام نظر نہیں آتیں، اگر کسی اختلاف کی خبر ملتی بھی ہے تو اس کی بنیاد کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ چند استثنا ضرور موجود ہیں اور ہمیشہ ہر جگہ ہوتے ہیں، لیکن انھیں معاشرے کے عمومی رجحان کا نمائندہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس تلخ حقیقت کا اظہار کئی مفکرین نے کیا ہے۔[۴۸] اور عاشور کاظمی نے تو برملا کہہ دیا ہے کہ ''انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ اپنی طاقت کے بل پر نہیں بلکہ سازشوں اور جاسوسی کے بہتر نظام سے کیا۔ کیوں کہ وہ ہندوستانیوں کی اس کمزوری سے واقف ہو چکے تھے کہ معمولی سی دولت یا عہدے کا لالچ دے کر بعض ہندوستانیوں کو خریدا جا سکتا ہے''۔[۴۹]

ڈالرمپل نے نیشنل آرکائیوز سے ملنے والی تحریروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء) کے والد محترم، مولوی محمد باقر (و-۱۸۵۷ء) جو دہلی اردو اخبار (آغاز ۱۸۳۷ء) کے ایڈیٹر تھے[۵۰] مئی ۱۸۵۷ء کے واقعے کے رونما ہوتے ہی نہایت جوش و خروش سے اپنے اخبار میں اسے اللہ کی طرف سے کفار پر اترنے والا عذاب قرار دیتے ہیں تاہم ۲۴ مئی تک ان کا لب و لہجہ ہی نہیں، رائے بھی بدل جاتی ہے اور وہ سپاہیوں کی لوٹ مار اور غارت گری کے شاکی نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ آخر کار وہ انگریزوں کے جاسوس کا کردار قبول کر لیتے ہیں اور ڈالرمپل کا دعویٰ ہے کہ جنگ کے دوران برطانوی کیمپ میں بھیجی جانے والی ان کے ہاتھ کی تحریریں انڈین نیشنل آرکائیوز میں اب تک محفوظ ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی اور نہ یہ بتایا کہ اس فوجی جاسوسی کے نتیجے میں مولوی محمد باقر کو انعام دینے کی بجائے پھانسی پر کیوں چڑھایا گیا؟[۵۱] اگر ان کی بات کو سچ مانا جائے تو اس واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی کے ہیرو دراصل لوٹ مار کرنے والے بے لگام سپاہی تھے جنھوں نے مذہب کو آڑ بنا کر امن و امان کو تہس نہس کر دیا تھا اور صرف عیسائی انگریز ہی نہیں، خود دہلی کے شرفا بھی ان سے نالاں تھے۔ اس آخری بات کا ثبوت اس عہد کی کئی ہندوستانی شخصیات کی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔ سرسید احمد خان تو خیر اس حوالے سے بدنام ہی بہت ہوئے مگر خواجہ حسن نظامی[۵۲] جیسے گدی نشین اور غالب جیسے حساس شاعر[۵۳] نے بھی باغیوں کے لیے مفسدین، فسادی، اور اس نوع کے دیگر الفاظ استعمال کیے ہیں جو ڈالرمپل کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔

اس کتاب میں جو تفاصیل پیش کی گئی ہیں انھیں پڑھ کر ایک بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انگریز کی کامیابی کا صرف ایک راز ہے اور وہ ہے نظم و ضبط اور قانون کی پابندی، خواہ اس کے لیے کتنی ہی مشقت اٹھانی پڑے۔ مغربی معاشروں نے ابتدائی طور پر سخت سزاؤں کی مدد سے

عوام الناس کو، یعنی صرف اشرافیہ کو نہیں بلکہ عوام کی اکثریت کو اپنے قانون کی پابندی کی عادت ڈال دی تھی اور ایک ایسا قانون بھی وضع کر لیا تھا جس کی پابندی سے کئی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ قانون کی تشکیل اور اس کے سخت گیر نفاذ سے انھوں نے سیاسی اور تمدنی دونوں محاذوں پر غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں (اگرچہ جنگ کے دوران انھوں نے خود اپنے ہی قانون کی دھجیاں بھی اڑائیں مگر چوں کہ اس سے خود ان کی قوم متاثر نہیں ہوتی تھی اس لیے اس کے کئی جواز گھڑ لیے گئے تھے)۔ ڈالرمپل نے اس عہد کی جو تفصیلات رقم کی ہیں ان میں نادانستہ یا غیر شعوری طور پر کئی ایسی مثالیں درج ہو گئی ہیں جو اس خیال کی توثیق کرتی ہیں اور ہندوستان کے مقامی باشندوں اور انگریز حاکموں کی نفسیات، معاشرتی رویے اور طرزِ زیست کا تقابل اکثر مقامات پر بین السطور واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ مثلاً انگریزی کیمپ میں زندگی ایک سخت نظم وضبط اور قوانین کی پابند تھی جب کہ دلّی کی مقامی آبادی کی بڑی اکثریت محض ایک ہجوم کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ جنگ کے دوران بھی ان کی شکست کا ایک بڑا سبب یہی تھا کہ مقامی فوج قیادت کے فقدان اور نظم وضبط کی کمی کا شکار تھی اور انفرادی شجاعت کے مظاہرے، عسکری تنظیم کی کمی کے باعث، شکست کو فتح میں تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ انگریزی تمدن میں عام سماجی شائستگی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں، اس کے افراد تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے مذاق کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اشرافیہ کی ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر ہندوستان کے مقامی افراد، خواہ وہ کسی مذہب یا فرقے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، زیادہ تر اجڈ، گنوار، بے ایمان اور دھوکے باز ہی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ چند استثنا بھی موجود ہیں لیکن ڈالرمپل نے ان واقعات کو زیادہ نمایاں نہیں کیا جن میں مقامی افراد نے اپنی جان پر کھیل کر انگریز خاندانوں کی حفاظت کی اور جن کی تفصیل دیگر ہندوستانی واقعہ نویسوں کے ہاں ملتی ہے۔[۵۴] البتہ ڈالرمپل کو اس امر کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ انھوں نے اپنے آپ کو غیر جانب دار اور غیر متعصب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ جہاں باغیوں یا مجاہدوں کی بہیمانہ حرکتوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں انگریز فوجیوں کے انتقام میں اندھے ہو جانے کی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہڈسن (۱۸۲۱ء۔ ۱۸۵۸ء) اور نکلسن (۱۸۲۱ء۔ ۱۸۵۷ء) کی دوں فطرتی کا وہ کھل کر اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران 'باغیوں' نے بھی انسانیت سوز حرکتیں کیں لیکن وہ تو ''اجڈ، گنوار، وحشی اور غیر متمدن'' ہندوستانی تھے۔ دنیا کی سب سے عظیم سلطنت کے ''تہذیب یافتہ، متمدن اور شائستہ'' فوجی افسران نے جس طرح بے گناہ مقامی آبادی کو اپنے غیض وغضب کا نشانہ بنایا اور خود اپنے ہی قانون کی پامالی کے مرتکب ہوئے، اس کا کوئی اخلاقی جواز نہ تھا۔ بلکہ بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو ہندوستانیوں کی بغاوت، جسے خواہ غدر کہیں یا جنگِ آزادی، بنیادی طور پر ایک اجتماعی بے اطمینانی کا اظہار تھی۔ وہ خود اپنے وطن میں رہ کر غیر ملکی استحصال کا شکار ہو رہے تھے، ان کی معاشی اور معاشرتی زندگی تلپٹ ہو گئی تھی[۵۵] اور ان کی بغاوت خواہ کتنی ہی غیر منظم کیوں نہ ہو، اس میں حریّت اور آزادی سے محبت کا جذبہ موجود تھا۔ دنیا کا کوئی بھی نظام اس جذبے کو غیر اخلاقی قرار نہیں دے سکتا لیکن انگریزوں کی اخلاقی حالت ایسی تھی کہ جنگ کے واقعات کا انتقام لینے کے لیے پرامن اور بے گناہ نہتے شہریوں، عورتوں، بچوں، زخمیوں اور بیماروں کو بے رحمی سے قتل کیا۔[۵۶] سپاہیوں اور شاہ زادوں سے جھوٹے وعدے کیے اور جان بخشی کی امید دلا کر انھیں گرفتار کیا مگر پھر گولیوں سے اڑا دیا گیا۔[۵۷] انھوں نے جس ملک پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا اسی کے حکمران کے خلاف بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا اور انصاف کی دھجیاں اڑا دیں مگر آج تک خود کو مہذب قرار دیتی ہے۔ ڈالرمپل نے انتہائی احتیاط سے ہی سہی، مگر انگریزی قانون کے اس اندھے پن کا اعتراف ضرور کیا ہے۔ پھر انھوں نے نہایت باریک بینی سے اس رعونت اور احساسِ تفاخر کا بھی تجزیہ کیا

ہے جو اٹھارویں صدی کے اختتام تک کمپنی کے سفید فام ملازمین کے عمومی رویے کا حصہ بن چکا تھا۔[۵۸] انھوں نے تفصیل سے رقم کیا ہے کہ کس طرح انیسویں صدی کے وسط تک، ایسٹ انڈیا کمپنی کے وہ سفید فام ملازم جو اٹھارویں صدی میں ہندوستانی تمدن میں پوری طرح ڈھل جانے کے رومانس میں مبتلا تھے، معدوم ہونے لگے اور ان کی نوجوان نسل کس طرح آہستہ آہستہ طاقت کے زعم میں، مقامی باشندوں سے دور ہونے لگی۔[۵۹] اس بڑھتی ہوئی خلیج نے ۱۸۵۷ء تک ایسی انتہائی صورت اختیار کر لی تھی کہ شہر کی آبادی واضح طور پر دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصے کا تہذیبی مرکز و منبع لال قلعہ تھا تو دوسری طرف کا تمدنی پس منظر ولایتی تھا۔ چنانچہ ڈالرمپل لکھتے ہیں کہ صبح کاذب کے وقت جب، لال قلعے میں مشاعرے یا رقص و سرود کی محفل اپنے انجام کو پہنچتی اور اربابِ نشاط دادِ فن دینے کے بعد اپنی بساط سمیٹ رہے ہوتے، جب بادشاہ معظم جمائیاں لیتے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھتے جہاں انھیں اگلے روز دن چڑھے تک نیند پوری کرنے کا موقع ملتا اور عمائدینِ شہر، اپنی اپنی دستار سنبھالے، اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے، اس وقت برطانوی فوجی کیمپ میں اگلے دن کی پریڈ میں حصہ لینے کی تیاری کا آغاز ہو چکا ہوتا۔ سپاہیوں سے لے کر افسرانِ بالا تک صبح سویرے بیدار ہو کر فوجی مشقوں میں مشغول ہو جاتے اور جب لال قلعے میں شاہ معظم کے ناشتے کے لیے مرغن حلوے تیار ہو رہے ہوتے، جن کی تیاری اور پیش کش کے لیے سینکڑوں افراد اپنا اپنا کمالِ ہنر آزماتے، اس وقت کیمپ کے افسر دن بھر کی مصروفیات سمیٹ چکے ہوتے۔ دونوں قوموں کے دسترخوان کی جو تفاصیل ڈالرمپل نے درج کی ہیں انھیں محض ثقافتی تنوع کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شکم پری کے قرینے اور آداب کسی قوم کی ترجیحات کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ امریکہ میں فاسٹ فوڈ کا رواج پانا محض فیشن کا شوق نہیں تھا، مغلیہ دسترخوان کی ایک جھلک ہی اس تہذیب کی سمت بتا دیتی ہے جسے ڈالرمپل نے ادب و فن کی نشاۃِ ثانیہ قرار دیا ہے۔

## [۳]

## ۱۸۵۷ء کی جنگ: اسباب، واقعات اور نتائج[۶۰]

انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں عملی طور پر دو طرح کی فوج تھی۔ ایک تو برطانوی فوج جو انتہائی مختصر تھی اور ۱۸۵۷ء میں اس کی تعداد تقریباً ۵۰۰۰ تھی؛ دوسری مقامی فوج جو برطانوی فوج سے چار گنا بڑی تھی یعنی اس کی تعداد ۲۳۳،۰۰۰ نفوس سے زیادہ تھی لیکن اس فوج میں مقامی افراد صرف نچلے درجے کے ملازم تھے اور اس کی کمان برطانوی افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ مقامی سپاہی بنیادی طور پر تنخواہ دار ملازم تھے اور اٹھارھویں صدی تک روایت یہ تھی کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ خدمات پر کشش تنخواہ اور مراعات کے عوض پیش کیا کرتے تھے اور مالِ غنیمت میں، جسے انگریز مؤرخین نے Loot کا نام دیا ہے، حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ تاہم انیسویں صدی کے آتے آتے ان کا پیشہ ورانہ وقار اور مادی منفعت اندوزی زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ انگریزوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں برطانوی فوجوں کی قلیل تعداد ان کے لیے کسی بڑے خطرے کا باعث بن سکتی ہے[۶۱] چنانچہ مقامی سپاہیوں کی ترقی کی امکانات آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگے تھے۔ پرانے اور تجربہ کار مقامی سپاہی، جن میں سے اکثر اونچی ہندو ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے، نوجوان، تاتجربہ کار اور ناپختہ ذہنوں کے مالک برطانوی افسران کے ماتحت کام کرنے پر مجبور تھے اور مغرور برطانوی افسروں کے رویوں سے نالاں تھے۔ ایسے واقعات کی تعداد خاصی قابلِ لحاظ ہے جن کے نتیجے میں مقامی سپاہی عدم تحفظ اور بے اطمینانی کا شکار ہونے لگے تھے۔ اس بات کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی ہندوستان کی

مختلف فوجی چھاؤنیوں میں کئی چھوٹی چھوٹی فوجی بغاوتیں ہو چکی تھیں۔ ۱۸۰۶ء میں ویلور، ۱۸۲۴ء میں بارک پور، ۱۸۲۵ء میں آسام، ۱۸۳۸ء میں شولہ پور اور ۱۸۳۷ء۔۱۸۴۲ء تک افغان جنگ کے حوالے سے ہونے والی چھوٹی چھوٹی بغاوتیں اس کی مثالیں ہیں۔ یہ تمام بغاوتیں اپنی اپنی چھاؤنیوں کے اندر ہی دبا دی گئیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق تنخواہ اور ملازمت کی شرائط پر عدم اطمینان کے اظہار سے تھا۔ تاہم ویلور میں ہونے والی بغاوت کی وجہ قدرے مختلف تھی جہاں برطانوی افسروں نے ہندو سپاہیوں کو اپنے ماتھے سے اپنی ذات کا علامتی نشان مٹانے اور مسلمان سپاہیوں کو ڈاڑھی مونڈنے کا حکم دے دیا تھا۔ اس حکم کے خلاف بغاوت ہوئی لیکن دبا دی گئی۔ اسی طرح ۱۸۲۴ء کی بغاوت کا سبب یہ تھا کہ بنگال کے ہندو سپاہیوں نے برما کی پہلی جنگ میں حصّہ لینے کے لیے سمندر پار جانے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ ذات پات اور چھوت چھات کا نظام انھیں مذہبی اعتبار سے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں برما کی دوسری جنگ کے دوران بھی اس سبب سے برطانوی افسران کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔[۶۲]

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں ہونے والی بغاوت کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی یا اتفاقیہ واقعات کا مجموعہ تھی، یہ معمہ پوری طرح حل نہیں ہوا۔ ڈالرمپل نے اسے ایک اچانک رونما ہونے اور چل نکلنے والا واقعہ قرار دیا ہے تاہم اس کے کچھ گہرے اسباب پر بحث بھی کی ہے۔ جب کہ کئی دیگر مؤرخین نے اس کے برعکس خیال کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اچانک ہونے کے باوجود سپاہیوں کا ایک گروہ ضرور ایسا تھا جو اس منصوبے پر ابتدائی بات چیت کر چکا تھا کیوں کہ ایک ہندوستانی فوجی افسر نے بغاوت پھوٹنے سے ایک شام قبل اپنے ہم کار برطانوی فوجی کو اس سے خبردار کر دیا تھا مگر اس کی بات کو زیادہ درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔[۶۳] خواجہ حسن نظامی نے بھی ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر لکھا ہے کہ غدر[۶۴] سے تقریباً ایک ماہ پہلے جامع مسجد دہلی میں ایک اشہار چسپاں کیا گیا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ ۱۱ مئی کو دہلی لوٹی جائے گی اور بڑا کشت وخون ہو گا۔[۶۵] دہلی کے اخبارات، نورِ مغربی اور صادق الاخبار میں مارچ ۱۸۵۷ء ہی سے ایرانی شہنشاہ کی آمد اور ہندوستان کو ''کافروں'' کے چنگل سے آزاد کرانے کی خوش خبریاں شائع ہونے لگی تھیں۔[۶۶] اسی طرح بادشاہ دہلی اور شاہِ ایران کے درمیان خفیہ مراسلت کی افواہیں بھی گرم تھیں۔[۶۷] جن کی نہ کوئی عقلی توجیہہ ملتی ہے نہ واقعاتی شہادت۔ چپاتیوں کی تقسیم کا معاملہ بھی بہت الجھا ہوا ہے۔[۶۸] ڈالرمپل نے اس کا ذکر تو کیا ہے مگر اس موضوع پر کوئی تحقیقی کاوش نظر نہیں آتی۔ انھوں نے جنگ کے آغاز کو سرسری طور پر بیان کر دیا ہے اور گہری نظر سے اس کے اسباب ومحرکات کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی۔ دراصل انھوں نے صرف اس بات سے سروکار رکھا ہے کہ مغل شہنشاہی کے خاتمے کے لمحات کی تصویر پیش کر دیں۔ اس لیے وہ کئی اہم نکات کی طرف محض اشارہ کر کے رہ گئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ زیادہ تر انگریزوں نے ہندوستان کو اپنا وطن کبھی نہیں سمجھا۔ چند ایک مخصوص شخصیات یا خاندانوں کو چھوڑ کر، مجموعی طور پر ان کا رویہ علیحدگی پسند کی طرف مائل رہا۔[۶۹] وہ یہاں کے شدید موسموں، گرد اور دھول سے اٹے ہوئے منظروں، بیماریوں اور ترقیاتی ڈھانچے کی کمی کے باعث اسے دل سے اپنانے کو کبھی تیار نہ ہوئے۔ ان کے تمام تر مفادات، دلچسپیاں اور مقاصدِ حیات ان کے اپنے ملک سے جڑے ہوئے تھے۔ مقامی آبادی کے ساتھ ان کا عمومی رویہ حقارت اور تنفر پر مبنی تھا۔[۷۰] اس بات سے ہٹ کر، بیگانگی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود مقامی افراد بھی یورپی اقوام کو اپنے برابر یا بہتر تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ انگریزوں کے بارے میں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں ابھی تک ایسے الفاظ، تراکیب اور استعارے موجود ہیں جو ان کے لیے مقامی افراد کی نفرت اور تحقیر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آتے آتے پورا ہندوستان کچھ اپنے حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار، مسلسل رسّہ کشی اور بدانتظامی اور کچھ انگریزوں کی کامیاب سازش یا منصوبہ بندی کے باعث اقتصادی اعتبار سے تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں ہندوستان آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے سفرنامے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے وسیع و عریض ملک کی سیاحت کی جس میں نہری نظام کی غیر موجودگی کے باعث زمینیں بنجر اور ویران تھیں۔[۷۱] چند بڑے شہروں اور حکمران طبقے کی حویلیوں اور محلوں سے قطع نظر، عام لوگ نہایت کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی مٹی یا گارے سے تعمیر شدہ رہائش گاہیں بنیادی سہولتوں سے محروم تھیں۔[۷۲] اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی عظیم الشان تاریخی عمارتیں کھنڈر ہو رہی تھیں۔[۷۳] ڈالرمپل کی کتاب میں اس صورت حال کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب Our Indian Musalmans ان اسباب و علل کا زیادہ گہرا اور بصیرت افروز تجزیہ پیش کرتی ہے جو مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خلیج کا سبب بنے۔

اب رہی یہ بات کہ ہندوستان پر قبضہ رفتہ رفتہ صورت پذیر ہوتے حالات و واقعات کا نتیجہ تھا یا کسی سوچی سمجھی سازش کا آخری مرحلہ، ڈالرمپل اس امر میں خاموش ہیں۔ ان کا اندازِ بیان ایسا ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی سوچی سمجھی سیاسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں سمجھتے۔ مگر کچھ مؤرخین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ہندوستان پر تسلط حاصل کرنے کا منصوبہ ۱۶۸۸ء ہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی ایک قرارداد میں شامل ہو گیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کی جانب پیش رفت چند خاص مصلحتوں کے تحت آہستہ روی اور احتیاط سے کی گئی۔[۷۴]

۱۸۵۷ء تک حالات یہ صورت اختیار کر چکے تھے کہ ہندوستانیوں کو مستقبل کا نقشہ صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ یہ جنگ غیر شعوری طور پر اس نفسیاتی کوشش کی آئینہ دار تھی جو ڈوبنے والا آخری لمحوں تک کرتا ہے۔

بہادر شاہ اس سازش کا حصہ نہیں تھے، انھیں اچانک اس کا حصہ بننا پڑا۔ یہ بات ڈالرمپل سے پہلے بھی کئی یورپی مؤرخین نے لکھی ہے۔[۷۵] لیکن ڈالرمپل نے بھی اس بات کی تائید میں خاصے ثبوت بہم پہنچائے ہیں اور ظفر کو تقریباً بے گناہ ثابت کیا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر جنگ کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ یہ جنگ درحقیقت عیسائی مشنریوں کے وعظ و تبلیغ اور جبراً عیسائیت پھیلانے کی کوششوں کا ردِعمل تھی اور اس کا آغاز برطانوی فوج کے غیر مطمئن سپاہیوں نے کیا تھا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سر جان ولیم کے۔، ٹی رائس ہومز، اور بی۔ میسن بھی اس سے پہلے اس جنگ کو سپاہیوں کی بغاوت کا نام دے چکے ہیں۔ البتہ سر الفریڈ لائل اور سر ولیم میور اس کا سارا الزام مسلمانوں کے سر رکھتے ہیں۔[۷۶] جب کہ ڈالرمپل کا کہنا ہے کہ ابتدائی طور پر ان سپاہیوں میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ بعد میں وہابی مجاہدین[۷۷] نے اسے اغوا کر لیا اور اسے مسلمانوں کی مذہبی جنگ (جہاد) قرار دے ڈالا۔ شکست کے بعد انھی ہزیمت خوردہ جہادیوں نے دیوبند میں مدرسہ قائم کر لیا اور بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ابھرنے والی طالبان تحریک کا نقطۂ آغاز بن گئے۔ یوں ڈالرمپل نے بڑی سادگی سے تاریخ کی تمام گم شدہ کڑیاں جوڑ کر حال کا رشتہ ماضی سے استوار کر دیا اور ان تمام معروضی حقائق کو نظر انداز کر دیا جو جنوبی ایشیا کی سیاست، معیشت اور معاشرت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی صورت حال، بڑی طاقتوں کے مفادات اور پوری ملتِ اسلامیہ کی کمزوری، جہالت اور پس ماندگی کا نتیجہ تھے۔

جہاں تک عیسائیت پھیلانے کی کوششوں کا ذکر ہے، ڈالرمپل نے عمومی طور پر اسے مشنریوں کی سرگرمیوں تک محدود قرار دیا ہے اور اس سرکاری موقف کو نظر انداز کر دیا ہے یا اسے نمایاں کرنے سے گریز کیا ہے، جو اکثر اعلیٰ عہدے داروں اور فوجیوں کا جزوِ ایمان تھا اور جس کے مطابق

ہندوستان اور اہلِ ہندوستان کی نجات صرف اور صرف عیسائیت کے دامن میں پناہ لینے سے ہی ممکن تھی۔[۷۸] صرف یہی نہیں بلکہ جنگ کے بعد ہندوستانی آبادی کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے بعد وہ اپنے فخر اور اطمینان کا اظہار بھی کرتے ہیں کیوں کہ انھوں نے ایک مذہبی فریضہ سرانجام دیا ہے۔اس کے بعد ان کے اور ''وہابی مجاہدین'' کے درمیان صرف اتنا ہی فرق رہ جاتا ہے کہ موخرالذکر خود کو مجاہدین کہتے ہیں اور اول الذکر نہیں کہتے۔ چند انتظامی افسران ایسے ضرور تھے جو مذہب کے معاملے میں برطانوی سیکولر تاثر کو ابھارنے اور قائم رکھنے کے لیے عملی اقدامات کرتے رہے لیکن ان کے پیشِ نظر سیاسی مصالح تھیں اور وہ جانتے تھے کہ مذہبی جانب داری ان کی مشکلات میں اضافے کا باعث ہو گی۔[۷۹]

ڈالرمپل نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ مسلمان علما اٹھارویں صدی تک ہندوستان میں برطانوی اثرات کے نتائج کے بارے میں ابہام کا شکار تھے اور ان میں سے کئی یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی قوت ہندوؤں کے مقابلے میں بہتر انتخاب ہو سکتی ہے۔صرف چند ایک علما ایسے تھے جنھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا اور کفار کے خلاف جہاد کے فتوے دے رہے تھے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان علما کی بڑی تعداد انگریزوں کو اپنا نجات دہندہ اور بہتر حکمران تسلیم کرنے پر تیار تھی مگر ایک قلیل تعداد (جو ان کے معتوب وہابی مجاہدین کی سرپرستی کر رہی تھی) انھیں جہاد پر اکساتی رہی۔[۸۰] وہابیوں کے بارے میں ان کی رائے کسی مستند ماخذ پر بنیاد نہیں رکھتی۔انھوں نے شاہ عبدالعزیز کے اس فتوے کا ذکر تو کیا ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا مگر اس فتوے کی باریکیوں کا تجزیہ نہیں کر پائے۔[۸۱] یہاں وہ ایک اور دلچسپ انکشاف بھی کرتے ہیں۔انھوں نے ماخذ کا حوالہ دیے بغیر کہا ہے کہ مجاہدین کو پنجابی تاجروں کی پشت پناہی حاصل تھی جو اپنے تجارتی مفادات کی حفاظت کے لیے برطانوی اقتدار سے آزادی چاہتے تھے۔ یوں وہ ہندوستان کی نئی مڈل کلاس کے طور پر ابھر رہے تھے اور شہنشاہیت اور جاگیردارانہ طبقے کے خلاف عوامی جدوجہد کی پہلی علامت تھے۔ یہ نقطۂ نظر، ان سے بہت پہلے پی سی جوشی اپنی کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔[۸۲] ڈالرمپل نے اس خیال کو جوشی کے سے جوش اور یقین کے ساتھ پیش نہیں کیا۔اس لیے کہ اگر وہ اس تاثر کو نمایاں کرتے تو ''باغیوں'' کو فسادی اور لٹیرے ثابت کرنا ممکن نہ رہتا بلکہ ان کی جدوجہد عوامی شعور کی بیداری کی علامت بن جاتی۔ یہ تاثر ان کے بنیادی نقطۂ نظر سے میل نہیں کھاتا۔ پھر جوشی نے اس جدوجہد کو کسی ایک علاقے سے منسوب نہیں کیا جب کہ ڈالرمپل نے اسے صرف پنجابی تاجروں سے وابستہ قرار دیا ہے جن کے پیشِ نظر کوئی نظریاتی مقصد نہیں، محض اپنے تجارتی مفادات کا تحفظ تھا۔ دوسری طرف یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ پنجاب کے چیف کمشنر سر جان لارنس نے ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو اپنے ایک خط میں پنجابی پلٹنوں کی وفاداری پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔[۸۳]

دراصل ڈالرمپل نے جن نئے مآخذ کو دریافت کیا ہے اور اس دریافت پر اپنے فخر کا اظہار بھی کیا ہے، وہ نیشنل آرکائیوز سے ملنے والے پیغامات، خطوط، شکایات، اور مقدمات کی ان تفاصیل پر مبنی ہیں جو جنگ کے دنوں کی معروضی صورت حال کو ظاہر کرتے ہیں مگر جنگ کے اسباب کا تعین کرنے میں محض اس کی معروضی صورتِ حال کا جائزہ کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ان معلومات سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے دوران واقعات کی سمت کس طرح متعین ہوتی گئی اور ان میں کیسے کیسے اتفاقات نے کتنا اہم کردار ادا کیا۔لیکن ہندوستان کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور اقتصادی مسائل جنھوں نے اس صورتِ حال کو پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، اس کتاب میں کہیں بھرپور انداز میں زیرِ بحث نہیں آئے۔ ڈالرمپل کی دریافت شدہ پرچیاں، نوٹ اور خط اس جوار بھاٹا کی گہرائیوں اور شدتوں کا اندازہ لگانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں نہ ان کے

اسباب ومحرکات کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ان واقعات کا پیش خیمہ تھے۔ بنیادی طور پر انھوں نے حقائق کے انکشاف کو کلیدی حیثیت عطا کی ہے اور ان کا تجزیہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ حقائق کو ان کی کلیت میں بیان نہیں کر سکے اسی لیے اس کتاب کے مطالعے سے ۱۸۵۷ء کے واقعے کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ یہ جنگ صرف دہلی تک محدود نہیں تھی۔ اس کے کئی اور پہلو اور جزو تھے جنھیں کتاب میں شامل نہیں کیا جا سکا اور ایسا ہونا قابلِ فہم بھی ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر یہ کتاب محض جزوی معلومات فراہم کرتی ہے۔ ان میں سے بھی بہت کم ایسی قابلِ ذکر معلومات ہیں جن کی دریافت ڈالرمپل کا کارنامہ قرار دیا جا سکے۔ بیشتر معلومات، سپیر کی کتاب Twilight of the Mughals اور اسلم پرویز کی کتاب ''بہادر شاہ ظفر'' میں پہلے سے موجود ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ڈالرمپل نے ہو بہو اسلم پرویز کی کتاب کو پیشِ نظر رکھا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن ان دونوں کتابوں کا مزاج اور اندازِ بیان ڈالرمپل کی کتاب سے مختلف ہے۔ یہ دونوں کتابیں علمی اور تحقیقی انداز میں تصنیف کی گئی ہیں جب کہ ڈالرمپل نے باوجود اپنی تحقیقی کاوشوں کے، اپنی تحریر کو ادبی شان اور ڈرامائی رنگ عطا کیے ہیں۔ اسلم پرویز کی کتاب اردو دان طبقے کو مخاطب کرتی ہے جب کہ ڈالرمپل کی کتاب انگریزی دان طبقے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ دوسرا طبقہ خواہ وہ جنوبی ایشیا میں ہو یا دیارِ مغرب میں، زیادہ مؤثر اور مقتدر ہے۔ سپیر کی کتاب اسی طبقے کے لیے لکھی گئی ہے لیکن سپیر کی تحریر میں بہادر شاہ ظفر کے لیے ستائش تو ہے، ویسی محبت اور ہم دردی نہیں جیسی دل سوزی ڈالرمپل کی تحریر میں جھلکتی ہے۔ ڈالرمپل نے اس کتاب کے ذریعے کم از کم یہ سمجھانے کی کوشش ضرور کی ہے کہ جنگ ستاون کی ذمہ داری نہ تو غریب بہادر شاہ پر ڈالی جا سکتی ہے اور نہ صرف مسلمانوں پر۔[۸۴] ڈالرمپل نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا ہے کہ سارے مسلمان انگریزوں کے دشمن نہیں تھے بلکہ کچھ تو انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اور یوں بین السطور یہ کہہ دیا ہے کہ برطانیہ نے دراصل ہندوستان کی منتشر، جاہل اور غیر مہذب قوم کو، خود انہی کے فائدے کے لیے غلام بنایا تھا۔ یہ نقطۂ نظر بھی نو آبادیاتی دور کے مصنفین سے مستعار ہے اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ برطانوی دورِ حکومت میں اس بارے میں سچ بولنا آسان تھا اور نہ مصلحت کا تقاضا، کیوں کہ بحیثیت قوم اپنی بقا کا معاملہ درپیش تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید سمیت اکثر مصنفین نے اپنی قوم کو اس جدوجہد سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔[۸۵]

تاہم ڈالرمپل کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو وقت کے مردہ خانے سے نکال کر چلتی پھرتی تصویر بنا دیا۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی مرقع نگاری اور دلکش ورواں اسلوب ہے۔ اس نے تصویر کاری کا ایسا ہنر دکھایا ہے کہ زندگی اس کتاب کے صفحات سے چھلکی پڑتی ہے۔ بیشک یہ زندگی بالکل ویسی نہ ہو، جیسی تھی بلکہ ویسی ہو، جیسی ڈالرمپل کو نظر آئی، مگر یہ سچ ہے کہ کتاب پڑھتے پڑھتے ماضی حال بن جاتا ہے۔ اس کی ریت دانتوں تلے کچکچاتی ہے، اس کا ذائقہ کانوں سے حلق میں ٹپکتا ہے اور اس کا موسم لہو کے درجۂ حرارت پر اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی یہ مرقع نگاری محض تخیل کا کرشمہ نہیں ہے۔ اس نے انڈین نیشنل آرکائیوز کے چھوٹے چھوٹے پرزوں سے معمولاتِ حیات کی وہ تفصیلات چرائی ہیں جو امورِ شاہاں اور رموزِ خسرواں میں شمار نہیں ہوتیں لیکن وقت کے دھارے کا رُخ متعین کرنے میں نہایت اہم ثابت ہوتی ہیں۔ اہلِ دہلی کی اپنے مجبور و درماندہ بادشاہ کے دربار میں دائر کی جانے والی شکایات، فریادیں، نالشیں، فرمائشیں، خفیہ خبر رسانی، عوام کے مزاج کا آئینہ بننے والی خبریں جو دہلی کے اردو اخبارات میں شائع ہوتی رہیں، ان کی زبان جوان کے فکر کی عکاس تھی، ان کے استعارے اور محاورے، ان کا طرزِ گفتگو، ان کے آداب ورسوم، غرض یہ کہ ماضی ایک زندہ حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور تاریخ وجود کے باطن سے نکل کر ظاہر پر منعکس ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ نقاد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ولیم ڈالرمپل نے اس

کتاب کے ذریعے یہ سمجھایا ہے کہ تاریخ کیسے لکھی جانی چاہیے۔[۸۶]

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اس دورِ ابتلا میں جنوبی ایشیا کی ایک مرحوم اسلامی سلطنت کا نوحہ لکھا ہے جب کہ دنیا بھر کے مسلمان اپنے ملّی وجود کے اثبات اور اپنے عقیدے کے دفاع کے لیے کسی ایسے مرکز کی تلاش میں ہیں جہاں سے وہ اپنوں کی اڑائی ہوئی گرد اور غیروں کے بچھائے ہوئے دام سے بچ کر اپنی اصل حقیقت سے خود بھی روشناس ہوں اور دوسروں کو بھی آشنا کر سکیں۔ ان کا انداز ہمدردانہ اور رویہ دوستانہ ہے۔ وہ ''پراسرار مشرق'' کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش پر داد اور شکریے دونوں کے مستحق ہیں۔

## حواشی و تعلیقات

۱۔ تفصیل کے لیے: http://www.williamdalrymple.uk.com/Pages/Biog.html اور
http://www.contemporarywriters.com/authors/?p=auth519D193A0f1092
11E7HsY1BA97C3 مورخہ ۹ دسمبر، ۲۰۰۹ء

۲۔ انگریزی فکشن کی معروف شخصیت۔ ادب میں جدیدیت کی تحریک کے ابتدائی علم برداروں میں سے ایک ہیں۔ ان کے معروف ناولوں میں *Mrs Dalloway* (۱۹۲۵ء)، *To The Lighthouse* (۱۹۲۷ء) اور *Orlando* (۱۹۲۸ء) شامل ہیں۔ ان کی والدہ جولیا پرنسپ سٹیفن (۱۸۴۶ء۔ ۱۸۹۵ء) ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور بعد میں انگلستان منتقل ہو گئیں۔ ورجینیا کے والد سر لیسلی سٹیفن ایک معروف نقاد، مصنف اور کوہ پیما تھے جن کی پہلی شادی ولیم تھیکرے کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یوں اس گھرانے کا ادب سے گہرا رشتہ تھا۔ تفصیل کے لیے:
نکلسن، نائجل ۲۰۰۰ء، Virginia Woolf، نیویارک،: پینگوئن گروپ
بیل، کوئنٹن، ۱۹۹۶(۱۹۷۲ء)، Virginia Woolf: A Biography، نیویارک
http://www.online-literature.com/virginia_woolf/

۳۔ http://en.wikipedia.org/wiki/William_Dalrymple_(historian) ، مورخہ ۹ دسمبر، ۲۰۰۹ء

۴۔ ولیم فریزر کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا لیکن اس نے ہندوستانی ثقافت کو اس حد تک اپنایا کہ اسے نصف ایشیائی کہا اور سمجھا جانے لگا۔ وہ ۱۸۰۵ء میں دلّی آیا اور اوکٹرلونی کے سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے لگا۔ بعد میں کابل مشن (۱۸۰۹ء) اور جنگِ نیپال (۱۸۱۴ء۔۱۸۱۵ء) میں نمایاں رہا۔ اس کے بعد آخری عمر تک دلّی ہی میں رہا۔ وہ تین سال تک (۱۸۳۳ء۔۱۸۳۵ء) دلی کا سول کمشنر اور گورنر جنرل کا ایجنٹ بھی رہا۔ ۱۸۳۵ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ چغتائی، ۲۰۰۹، بازیافت، ص ۲۱، ص ۳۱۔

۵۔ http://www.williamdalrymple.uk.com/Pages/Biog.html، مورخہ ۹ دسمبر، ۲۰۰۹ء

۶۔ تفصیل کے لیے: http://www.williamdalrymple.uk.com/Pages/Biog.html

۷۔ چیمبرلین، ص۸۸، ملک،، ص۱

۸۔ بیلی، ص۱۳۷

۹۔ کتابیات کی مکمل فہرست کے لیے: پرویز، ۲۰۰۸ء، ص۳۳۵۔۳۷۹، نیز محمد عالم مختارِحق، صحیفہ، ص۲۴۱۔۲۵۲۔

۱۰۔ ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ یادگار کے حوالے سے شائع ہونے والی اہم کتابیں ہیں: ضیاءالدین لاہوری مرتبہ مغلیہ دہلی کے آخری ایام، ڈاکٹر ضیاءالحسن، ڈاکٹر ناصر عباس نیر مرتبہ جنگِ آزادی اور اردو زبان و ادب، صلاح الدّین ملک *1857: War of Independence or Clash of Civilizations*، اسلم پرویز مرتبہ سن ستاون کی دلّی اور بہادر شاہ ظفر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، صحیفہ: کتاب ۱۸۵۷ء۔

۱۱۔ اکبر کے دین الٰہی کے تفصیلی تجزیہ کے لیے: *Akbar and Religion* (خلیق احمد نظامی)، *Akbar, The Architect of the Mughal Empire* (اشتیاق حسین قریشی)، برصغیر میں اسلامی کلچر (عزیز احمد) باب ششم، ص۲۵۵۔۲۷۲،، *The Din-i-Ilahi* (موہن لال)

۱۲۔ ڈالرمپل، گریشم کالج سے خطاب:
http://www.gresham.ac.uk/printtranscript.asp?eventId=755

۱۳۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام، مشمولہ غالب کے خطوط، جلد دوم، ص۲۱۷، رالف رسل اور خورشید الاسلام نے اس خط کا ذکر اور ترجمہ اپنی انگریزی کتاب ''غالب'' میں کیا ہے۔ تصنیفِ مذکور، ص۲۴۹۔

۱۴۔ ڈالرمپل، گریشم کالج سے خطاب، مکمل متن کے لیے:
http://www.gresham.ac.uk/printtranscript.asp?eventId=755

۱۵۔ فین، ص۱۳۹

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ قریشی، ۱۹۹۹ء، ص۲۹۶۔۲۹۷

۱۸۔ پرویز، ۱۹۸۶ء، ص۱۳۲

۱۹۔ ایضاً، ص۶۱

۲۰۔ ایضاً، ص۱۱۲۔۱۱۶

۲۱۔ سپیر، ص۷۲۔۸۳

۲۲۔ پرویز، ۱۹۸۶ء ص۲۷۷،۔۲۸۰، ذکاءاللہ، ص۳۴۶

۲۳۔ سپیر، ص۷۱۔۷۲

۲۴۔ ایضاً، ص۴۱

۲۵۔ ایضاً، ص۴۱۔۴۲

۲۶۔ ایضاً،ص۴۲۔۴۳

۲۷۔ عرش تیموری،ص۴۱۔۴۲،بحوالہ پرویز، ص۴۱

۲۸۔ طامس میٹکاف،۲۶جون۱۸۲۷ء،بحوالہ سپیر،ص۳۷

۲۹۔ قریشی،۱۹۹۹ء، ص۲۹۶۔۲۹۷،پرویز،ص۴۲،اخبار جامِ جہاں نما بحوالہ پرویز،ص۴۵

۳۰۔ ''آخری مغل شہنشاہ بھی دربار تو بڑے تزک واحتشام سے کرتے تھے لیکن عملی طور پر ان میں اتنی صلاحیت اور قوت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کسی بڑی تحریک کی قیادت کر سکتے۔''، پرویز،۲۰۰۸،ص۹۶

۳۱۔ ذکاءاللہ،ص۶۹

۳۲۔ احسن الاخبار،۱۵اکتوبر۱۸۴۵ء،بحوالہ پرویز،ص۶۱

۳۳۔ پرویز،۱۹۸۶ء،ص۶۶۔۷۰

۳۴۔ طامس میٹکاف کی ڈائری،۹۲۔۹۴،بحوالہ پرویز،ص۵۴۔۶۰

۳۵۔ پرویز،۱۹۸۶ء،ص۶۵

۳۶۔ ایضاً،ص۷۵

۳۷۔ ایضاً،ص ۷۶

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً،ص۱۰۵

۴۰۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے: کے۔ کے۔عزیز کی کتاب، *The British in India: A Study In Imperialism*،ص۲۳۸۔۲۴۴

۴۱۔ تفصیل کے لیے: مسلمانوں کی جدو جہدِ آزادی ،معین الدین عقیل،مسائل،افکار وتحریکات،لاہور:مکتبۂ تعمیرِ انسانیت

۴۲۔ مسلمان علما نے، چند مستثنیات سے قطع نظر، عام طور پر اپنے حکم رانوں کی ہوسِ اقتدار اور سیاسی مظالم پر بند باندھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ان کے لیے یہی امر باعثِ اطمینان رہا کہ نام ہی کا سہی، مسلمانوں کا امیر کلمہ گو تو ہے۔اطاعتِ امیر کا جو تصور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی مصلحت کیشی نے رائج کیا تھا اس نے عوامی شعور کا راستہ روکنے اور صاحبانِ اقتدار کو کھل کھیلنے کے ایسے مواقع فراہم کیے جنھوں نے تاریخ کو داغ دار کر دیا۔علما کے پیشِ نظر یقیناً ان کی اپنی مجبوریاں اور قومی مصالح تھیں مگر عوام کو اس کا بہت نقصان اٹھانا پڑا۔یہی طرزِ عمل عوام نے اختیار کر لیا اور آہستہ آہستہ ظاہر پرستی کی روش نے ایسی جڑ پکڑی کہ معاشرے کا قالب دین کی روح سے خالی ہو کر رہ گیا اور ملوکیت پسندی کی راہ ہموار ہوئی۔مثال کے طور پر، غلام قادر روہیلہ نے ۱۰اگست،۱۷۸۸ء کو جب شاہ عالم ثانی (۱۷۲۷ء۱۸۰۶ء) آنکھیں نکالیں، (فرینکلن،ص۱۷۶) تو میرؔ جیسا درویش صفت شاعر بھی پکار اٹھا:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اور ایک صدی بعد اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) نے بھی نعرہ لگا دیا:

رہیلہ کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

مگر یہی غلام قادر رہیلہ جب دس سالہ طفلِ خوب رو تھا اور قید ہو کر شاہ عالم کے دربار میں پہنچا تھا تو اپنی نظر بازی کے شوق میں شاہ عالم نے اسے جوہرِ مردانگی سے محروم کروا دیا اور اسے دربار میں زنانہ لباس پہن کر آنے کا حکم دے دیا تھا ۔(نادراتِ شاہی ، ص۲۹، بحوالہ پرویز، ص۳۱، اکرام، ۲۰۰۰ء، ص۴۹۴) تب کسی نے شاہ عالم کے اس عمل کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ یہ واقعہ محض ایک مثال ہے اور تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

۴۳۔ قریشی، ۱۹۹۹ء، ص۲۹۷

۴۴۔ ایضاً، ص۲۳۸، اکرام، ۱۹۸۷ء، ص۹

۴۵۔ عقیل، صحیفہ، ص۱۴

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ قریشی، ۱۹۹۹ء، ص، ۲۲۱۔۲۲۴، ایم۔ مجیب، ص۵۰۳

۴۸۔ اکرام، ۱۹۷۵ء، ص۲۹۱۔۲۹۴

۴۹۔ کاظمی، ص۱۰

۵۰۔ اس حوالے سے رفاقت علی شاہد کا یہ بیان قابلِ غور ہے: ''دہلی اردو اخبار کا اجرا مولوی محمد باقر نے کیا تھا لیکن ان کا نام کسی حیثیت میں اخبار پر کبھی شائع نہیں ہوا۔ اخبار میں اس کے مدیر کا نام بھی کبھی شائع نہیں ہوتا تھا۔ محض ناشر و طابع و مطبع کا نام ہوتا تھا۔ بعض اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی اردو اخبار کی ادارت شروع سے آخر تک مولوی محمد باقر کے سپرد رہی اگرچہ اس سلسلے میں کوئی بیّن ثبوت اور واضح شہادت میسر نہیں۔''، صحیفہ، ص۱۵۰

۵۱۔ مولوی محمد باقر کو دی جانے والی سزائے موت کے اسباب و واقعات کے مفصل بیان کے لیے: امداد صابری، ۱۹۴۹ء، فرنگیوں کا جال، عبدالقادر، شیخ، Famous Urdu Poets and Writers، عبدالحق، مولوی، ۱۹۴۵ء مرحوم دہلی کالج، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، بحوالہ شاہد، صحیفہ، ص۱۴۶۔۱۴۷

۵۲۔ نظامی، خواجہ حسن، ص۱

۵۳۔ دستنبو، کلیاتِ غالب (فارسی)، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۷۲ء، بحوالہ، کے ایم اشرف، غالب اور بغاوت ۱۸۵۷ء، ص۳۶۱، نیز خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم،

۵۴۔ نظامی، خواجہ حسن، ۱۹۲۲ء، ص۱

۵۵۔ تفصیل کے لیے: ہنٹر، Our Indian Musalmans

۵۶۔ کاظمی، ص۴۴۔۴۵

۵۷۔ ایضاً، چیمبرلین، ص۹۵

۵۸۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے: جے۔جے۔کلارک، Oriental Enlightenment

۵۹۔ اس موضوع پر ڈالرمپل کی کتاب *The White Mughal* کے علاوہ سپیر اور کے کے عزیز کی کتابوں میں بھی تفصیل ملتی ہے۔مغربی اقوام ابتدا میں ہندوستان کے اسرار و رموز سے مسحور نظر آتی ہیں۔انھیں قدیم ہندو فلسفے، مذاہب اور طرزِ معاشرت میں گہری دلچسپی محسوس ہوتی ہے، وہ یہاں کے قدیم رسوم و رواج میں انسانی دانش و بصیرت کا عمل دخل دیکھتی ہیں۔لیکن یہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد ان کے یہ تصورات بکھرنے لگتے ہیں۔ہندوستان کا جاگیردارانہ معاشرہ، شخصی حکومتوں کے زوال کے بعد جس بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہوا، اس نے ان تمام رنگین تصورات کے بت پاش پاش کر دیئے۔اٹھارویں صدی تک ہندوستان کے طول و عرض میں زندگی جس بدنظمی اور بے ترتیبی کا شکار ہو چکی تھی اسے قریب سے دیکھنے کے بعد ''پراسرار مشرق'' کا جادو ٹوٹ گیا اور صرف ''جاہل، غیر مہذب اور وحشی نیٹیو (natives)'' باقی بچ گئے۔اور یہی رویہ ابھی تک قائم ہے۔جے۔جے۔کلارک لکھتا ہے:

> The contradiction between these two opinions points to an age-old ambivalence in the West's attitude towards the East. On the one hand, it has been a source of inspiration, fount of an ancient wisdom, a culturally rich civilization, which is far superior to and can be used to reflect on the inadequacies of, our own. On the other, it is an alien region of looming threat and impenetrable mystery, long lost in its stagnant past untill rudely awakened by the modernising impact of the West.

کلارک، ص۳

۶۰۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اسے سپاہیوں کی بغاوت، غدر یا میوٹنی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔تقسیم کے بعد جب سامراجی گرفت ڈھیلی پڑی تو ہندوستان اور پاکستان میں اسے ''جنگِ آزادی'' کہا جانے لگا۔احمد، عزیز، *Studies in Islamic Culture in Indian Environment*، ص۵۵

۶۱۔ چیمبرلین، ص۸۹

۶۲۔ ایضاً، ص۸۹۔۹۳

۶۳۔ ایضاً، ص۹۲

۶۴۔ نوآبادیاتی دور کے تقریباً تمام مصنفین نے اس جنگ کے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے اور مجاہدین کے لیے مفسدین، وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۶۵۔ نظامی، خواجہ حسن، ۱۹۲۲ء، ص ۱

۶۶۔ ضیاءالدین لاہوری، ص ۱۲۔۲۱، کاظمی، ص ۲۰

۶۷۔ کاظمی، ص ۲۰

۶۸۔ ضیاءالدین لاہوری، ص ۲۸۔۳۰

۶۹۔ عزیز، کے۔ کے۔، ص ۲۲۲

۷۰۔ اگر ہم خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں تو اس کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اتنے بڑے ملک کی کثیر آبادی تہذیب و شائستگی کے ان پہلوؤں سے ناواقفِ محض تھی جو خوش حالی اور عروج کا دور لے کر آتا ہے۔ عام معاشرتی رویے خود غرضی، جہالت اور منافقت پر مبنی تھے۔ اعلیٰ انسانی اوصاف اور فضائل تمام طبقوں میں بالعموم اور نچلے طبقے میں بالخصوص نمایاں طور پر معدوم نظر آتے ہیں کیوں کہ نچلا طبقہ اکثر افلاس کا شکار ہونے کے باعث تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف تعداد میں یہی طبقہ سب سے زیادہ تھا اس لیے قوم کے بارے میں عمومی رائے پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونا بعید از قیاس نہیں۔ انیسویں صدی میں لکھی جانے والی لطف اللہ کی آپ بیتی میں جمعہ نامی ایک ٹھگ کا ذکر ہے جو مسافروں کو قتل کر کے ان کا مال ہتھیانا اپنا پیشہ سمجھتا تھا۔ اپنے پیشے کے جواز میں وہ جو دلائل پیش کرتا ہے وہ دل دہلا دینے والے ہیں۔ (علی، مبارک، ص ۵۳۔۵۹) ان میں انقلابِ فرانس سے لے کر روس کے سوشلسٹ انقلاب تک کی انتقام زدہ بغاوت کی بو ہے۔

۷۱۔ سپیر، ص ۶، بیلی، ص ۱۳۸۔۱۴۰

۷۲۔ لیڈی ولسن، *Letters from India*، فین، *Five Years in India*، فارسٹر، *A Journey from Bengal to England*

۷۳۔ سپیر، ص ۶

۷۴۔ اکرام، ۲۰۰۰ء، ص ۵۴۸

۷۵۔ چیمبرلین، ص ۹۳

۷۶۔ کاظمی، ص ۴۶۔۴۷

۷۷۔ ڈالرمپل نے مجاہدین کی جس جماعت کو وہابی کہا ہے، اس کا کوئی باقاعدہ تعلق محمد ابن عبدالوہاب (۱۷۰۷ء۔۱۷۸۷ء) کی حجاز میں آغاز کردہ تحریک سے نہیں تھا۔ مسلکی اعتبار سے ہندوستانی مسلمان بشمول ان مجاہدین کے، حنفی یا شافعی مسلک کے پیرو تھے۔ (اومالی، ص ۳۹۷) برطانوی مؤرخین نے مجاہدین کی تحریک کو غلط طور پر وہابی تحریک سے منسلک قرار دے دیا۔ احمد، عزیز، ۱۹۷۵ء، ص ۳۸۳

۷۸۔ چیمبرلین، ص ۸۹۔۹۳۔

۷۹۔ عزیز، کے۔ کے۔، ص ۲۳۸۔۲۴۴

۸۰۔ ان خیالات کا اظہار کئی مسلم مفکرین نے بھی کیا ہے جن میں عزیز احمد بھی شامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

Recent Hagiographical historiography has over-emphasized the participation and the role of "Ulama" (Muslim theologians) in the Mutiny. While the influence of the Ulama on the course of the Mutiny can be stated as minimal, some of them at Thana Bhawan did put up some resistence against British, while some others in Dehli, presumably under pressure from the Mutineer Bakht Khan, issued a *fatwa* (edict) proclaiming holy war."

(احمد،عزیز،۱۹۷۵ء،ص۳۸۶)

مسلمان مصنفین اس بارے میں دو متضاد آرا رکھتے ہیں۔ایک گروہ کی ترجمانی تو عزیز احمد نے کی ہے جب کہ دوسرا گروہ وہابی علما کو واضح طور پر خراجِ تحسین پیش کرتا ہے کیوں کہ انھوں نے اس جنگ کو مسلمانوں کی غیرت ایمانی اور ملّی وجود کے بقا کی جدوجہد بنا دیا اور یوں ان کے نزدیک یہ ایک مقدس جنگ یا جہاد تھی محض سپاہیوں کی بغاوت نہیں۔کے۔ایم۔اشرف،انقلاب اٹھارہ سو ستاون،ص۸۶۔۱۰۵

۸۱۔ تفصیل کے لیے: رضوی،۲۲۵۔۲۳۶

۸۲۔ جوشی نے اپنے اس خیال کی بنیاد کارل مارکس کے تجزیے پر رکھی ہے اور اپنے مضمون پر تفصیل سے یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ، ہندوستان کے عوام کی سیاسی، معاشی اور مذہبی استحصال کے خلاف ایک باشعور اور سوچی سمجھی کاوش تھی۔(جوشی، ص۱۳۲۔۲۲۹) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''مختلف زبانوں کے ہندوستانی قومی ادب میں جو حبِ وطن کا رجحان ہے۔وہ بڑی حد تک ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی دین ہے۔اس سے ہندوستانی ادبا کو درد و کرب، جدوجہد اور ایثار نفس کے ڈرامائی واقعات اور قوم پرستی کے بلند پایہ مضامین میسر آئے ہیں۔''۔جوشی،ص۷

۸۳۔ نظامی،خواجہ حسن،۱۹۲۵ء،ص۳۱

۸۴۔ یہ الگ بات کہ بعد ازاں خود مسلمانوں نے اس جنگ کو نہ صرف پوری طرح اپنا لیا تھا بلکہ اسے دورِ زوال میں اپنی بقا اور فروغ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز بھی قرار دے دیا۔

۸۵۔ سرسید،رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند،آگرہ

۸۶۔ خوشونت سنگھ،عقبی سرِ ورق، *The Last Mughal*

## فہرست اسنادِ محولّہ

احمد،عزیز،۱۹۷۰ء، *The Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*، پاکستان: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس۔

۔۔۔۔،۱۹۷۵ء، Islamic Reform Movements، مشمولہ، *A Cultural History of India*، مرتبہ باشم، آکسفورڈ: کلیرنڈن پریس، ص۳۸۳۔۳۹۰

۔۔۔۔،۲۰۰۵ء، برصغیر میں اسلامی کلچر ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۔۔۔۔،۲۰۰۶ء، برصغیر میں اسلامی جدیدیت ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

احمد شہزاد، رفاقت علی شاہد، اشرف جاوید، مدیر، ۲۰۰۷ء، صحیفہ، ۱۸۸۔۱۸۹، لاہور: مجلسِ ترقی ادب

اکرام، شیخ محمد، ۱۹۷۵ء، موجِ کوثر، لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ

۔۔۔۔۔، ۱۹۸۷ء، *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۔۔۔۔۔،۲۰۰۰ء، *A History of Muslim Civilization in India and Pakistan*، لاہور: دارۂ ثقافتِ اسلامیہ

اومالی، ایل۔ایس۔ایس، ۱۹۶۸ء(۱۹۴۱ء)، *Modern India and the West*، لندن، نیویارک، ٹورنٹو: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس

باشم، اے۔ایل۔، ۱۹۷۵ء، *A Cultural History of India*، آکسفورڈ: کلیرنڈن پریس

بیل، کوئنٹن، ۱۹۹۶(۱۹۷۲ء)، Virginia Woolf: A Biography، نیویارک

بیلی، سی۔اے، *The New Cambridge History of India*، حصّہ دوم، جلد اول، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس۔

پرویز، اسلم، ۱۹۸۶ء، بہادر شاہ ظفر، دہلی: انجمن ترقی اُردو (ہند)۔

۔۔۔۔،۲۰۰۸ء، سن ستاون کی دلّی اور بہادر شاہ ظفر، نئی دہلی: انجمنِ ترقی اُردو ہند

جوشی، پی۔سی۔، ۱۹۹۸ء(۱۹۷۲ء)، انقلاب ۱۸۵۷ء، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ۔اردو زبان

چغتائی، محمد اکرام، ۲۰۰۹ء، سیر المنازل (نسخۂ برلن)، مشمولہ، بازیافت، ۱۴، لاہور: ص۱۱۔۴۴

چوھدری، موہن لال رامے، ۱۹۹۷ء، *The Din-i-Ilahi*، دہلی: منشی رام منوہر لال، پبلشرز۔

چیمبرلین، ایم۔ای۔، ۱۹۷۴ء، *Britian and Indian: The Interaction of Two People*، ڈیوڈ اینڈ چارلس: نیوٹن ابیٹ۔

خان، سرسید احمد، ۱۹۰۳ء، اسبابِ بغاوت ہند، آگرہ، مطبع مفیدِ عام

ڈالرمپل، ولیم، ۲۰۰۴ء، *The White Mughals*، لندن، ہارپر پیرینیل

ذکاءاللہ، مولوی، ۱۹۰۴ء، تاریخِ عروجِ انگلیشیہ، دہلی: شمس المطابع

۔۔۔۔، س۔ن، تاریخِ ہندوستان، جلد نہم، علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ

رضوی، سید اطہر عباس، ۲۰۰۴ء، *Shah Abd-ul-Aziz: Puritanism, Sectarian, Polemics and*

Jihad، لاہور: سہیل اکادمی
ژاک مانٹ، وکٹر، ۱۹۷۹ء، Letters from India، جلد: اول ودوم، کراچی، آکسفورڈ یونی ورسٹی
سپیر، پرسی ول، ۱۹۸۰ء (۱۹۵۱ء)، Twilight of the Mughals، کراچی: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس
ضیاءالدین لاہوری، ۲۰۰۷ء، مغلیہ دہلی کے آخری ایام، اسلام آباد، پورب اکادمی
ضیاءالحسن، نیر، ناصر عباس (مرتبین)، ۲۰۰۷ء، جنگِ آزادی اور اُردو ادب، لاہور، پنجاب یونی ورسٹی
عبداللطیف، سید، ۱۹۷۹ء، (۱۹۵۸ء)، An outline of the Cultural History of India، دہلی: اورینٹل ری پرنٹ۔
عزیز۔ کے۔ کے، ۱۹۷۵ء، The British in India: A Study in Imperialism، ادارۂ تحقیق برائے تاریخ و ثقافت، اسلام آباد
عقیل، معین الدّین، ڈاکٹر، ۲۰۰۷ء، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء: اسباب و نتائج، مشمولہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور، شمارہ ۱۸۸۔۸۹، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، ص ۹۔۲۳
۔۔۔۔، ۲۰۰۸ء، تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ، لاہور: مجلس ترقی ادب
۔۔۔۔، ۱۹۸۲ء، مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی، مسائل، افکار و تحریکات، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت
علی، مبارک، ڈاکٹر، مترجم، ۱۹۹۶ء، انیسویں صدی کا ہندوستان: لطف الله کی آپ بیتی، لاہور: فکشن ہاؤس
فارسٹر، جارج، ۱۹۸۷ء، A Journey From Bengal to England، جلد اول و دوم، نیو دہلی: نرمل پبلشرز
فرینکلن، ڈبلیو، ۱۹۸۸ء، Reign of Shah Alam، لاہور: ری پبلکن بکس
فین، ہنری ایڈورڈ، ۱۹۸۶ء، Five Years in India، نیو دہلی: نرمل پبلشرز
قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۷۸ء، Akbar, The Architect of the Mughal Empire، کراچی: معارف لمیٹڈ۔
قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۹۹ء، برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، کراچی، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
کلارک، جے۔ جے۔، ۱۹۹۷ء، Oriental Enlightenment، لندن اور نیو یارک: رتلج
مجیب، ایم، س۔ن۔، The Indian Muslims، لاہور: بک ٹریڈرز۔
مختارِ حق، محمد عالم، ۲۰۰۷ء، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ اور میرا کتب خانہ، مشمولہ: صحیفہ، شمارہ ۱۸۸۔۱۸۹، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ص ۲۴۱۔۲۵۳
ملک، صلاح الدین، ۲۰۰۷ء، War of Indiependance or Clash of Civilization، آکسفورڈ
مہر، غلام رسول، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز۔
نظامی، خواجہ حسن، ۱۹۲۲ء، بچارے انگریزوں کی بپتا، دہلی: ابنِ عربی کارکن حلقۂ مشائخ بک ڈپو۔
۔۔۔۔۔۔، ۱۹۲۵ء، محاصرہ دہلی کے خطوط، دہلی: ابنِ عربی کارکن حلقۂ مشائخ بک ڈپو۔
نظامی، خلیق احمد، ۱۹۸۹ء، Akbar and Religion، دہلی، ادارۂ ادبیات دہلی۔

نکلسن، نائجل ۲۰۰۰ء، Virginia Woolf، نیویارک: پینگوئن گروپ
ولسن، لیڈی، ۱۹۸۴ء، Letters from India، لندن، سینچری پبلشنگ
ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، ۱۹۶۴ء (۱۸۷۱ء)، The Indian Musalmans، لاہور: پریمیر بک ہاؤس۔

---

**Abstract**

*"The Last Mughal" by William Dalrymple is a historical narrative that deals with a very sensitive issue of South Asian History. The War of Independence, as it is described by some post colonial historians or Mutiny, as called by most of the British writers, has been discussed in this book, in the context of Dehli and the court of the last Mughal Emperor, Bahadar Shah Zafar, the protagonist of the book. Dalrymple has founded his thesis on the ideas presented by his predecessors like Percival Spear and Aslam Pervaiz. He has a very sympathetic attitude towards the Mughal King and has attempted to prove that he, along with the elite of the Capital, was not involved, neither interested in the riots initiated by the rebels of the British Army. The reviewer has analysed his view point in the context of past and present Indian and British writings.*